سعید احمد اکبر آبادی

مغرب میں مذہب

[مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء - ۱۹۸۵ء) ماضی قریب کے ایک روشن فکر عالم دین تھے۔ مرحوم ۶۳-۱۹۶۲ء میں میک گل یونیورسٹی-مانٹریل کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے بطور "مہمان استاد" منسلک رہے تھے۔ انہوں نے دیارِ مغرب میں اپنے قیام کے تجربات و مشاہدات ایک طویل مقالے کی صورت میں "دیار غرب میں مشاہدات و تاثرات" کے زیر عنوان ماہنامہ "برہان" (دہلی) میں شائع کیے تھے۔ اس مقالے میں انہوں نے مغربی دنیا، بالخصوص شمالی امریکہ میں مطالعہ اسلامیات میں مصروف مستشرقین اور اُن کے اداروں کا ذکر کیا ہے، مغربی معاشرے پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں اور شمالی امریکہ کی مسلم برادری اور اس کی صورت حال پر گفتگو کی ہے۔ مولانا مرحوم کا یہ مقالہ یا سفر نامہ، راقم الحروف کی محدود معلومات کے مطابق کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک حصہ "عالم اسلام اور عیسائیت" کے قارئین کے لیے بطور قندِ مکرر نقل کیا جاتا ہے۔ "مغرب میں مذہب" کا عنوان بھی خود مولانا مرحوم ہی کا تجویز کردہ ہے۔ مدیر]

ہم میں بہت سے لوگ جنہیں یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوا، یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب میں مذہب، خدا پرستی اور رُوحانیت کا کہیں وجود نہیں، وہاں مادہ پرستی کا زور ہے اور گناہ یا ثواب کا کوئی تصور نہیں، حالانکہ یہ بات غلط ہے ٹھیک ایسے ہی جیسے ہمارا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہم میں وہ لوگ جو مغربی طرز زندگی کو پسند کرتے اور مغربی لباس میں نظر آتے ہیں اور اسی طرح جو خواتین پردہ نہیں کرتیں اور مردوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہیں، دونوں مذہب سے بیگانہ اور اس کی روایات و تہذیب سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اب ہر ملک میں آپ کو بکثرت ایسے مسلمان نظر آئیں گے کہ دیکھنے میں بالکل فرنگی، لیکن نماز روزہ کے سختی سے پابند اور اس کی روایات و شعائر کا ادب پورے طور پر ملحوظ! جو بات غلط ہے وہ بہر حال غلط ہی رہے گی اور ایک مرد پارسا کے پینے سے شراب جائز نہیں ہو جائے گی، لیکن گزارش کا مقصد یہ ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کی محض ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر اس کے باطنی معتقدات و

افکار اور اخلاقی کردار کے متعلق فیصلہ کر دینا قرین انصاف نہیں۔ چنانچہ ایک مشرقی جب یورپ میں پہلے پہل داخل ہوتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ جس خطہ زمین کو وہ مذہب، اور خدا شناسی سے بالکل بیگانہ سمجھے ہوئے تھا، وہاں کی عام زندگی آج بھی بڑی حد تک مذہب کے زیر اثر ہے، یوں تو جدت پسندی کے ساتھ قدامت پرستی کے مظاہر و آثار پورے یورپ میں بکھرے ہوئے ہیں، لیکن مونٹریل کا عالم تو یہ ہے کہ جس طرح ہر بڑے بازار میں آپ کو بیشتر ایسی دکانیں ملیں گی جہاں قدیم چیزیں از قسم فرنیچر ظروف واوانی، لباس، اسلحہ اور سامان آرائش وغیرہ، فروخت ہوتی ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ گرجا اور یہودی معابد آپ کو قدم قدم پر نظر آئیں گے۔ ادھر ادھر مذہبی ادارے بائبل سوسائٹیاں بھی دکھائی دیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی ادارے اور مراکز جس تنظیم، ایثار و خلوص اور سادگی و جوش کے ساتھ اور بڑے وسیع پیمانہ پر مغرب میں کام کر رہے ہیں، مشرق ان سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتا ہے، جس طرح نیویارک اونچی اونچی عمارتوں کا شہر کہلاتا ہے، اسی طرح مونٹریل گرجاؤں کا شہر ہے، اور گرجا بھی کیسے ؟ نہایت عالی شان، بہت وسیع اور نہایت قیمتی سازو سامان سے آراستہ و پیراستہ۔ اتوار کو یا کسی تقریب کے دن مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کا ان میں ہجوم ہوتا ہے، جو بڑے اہتمام کے ساتھ صاف ستھرا لباس پہن کر یہاں جمع ہوتے اور عبادت کرتے ہیں، عبادت کے اوقات کے علاوہ ان گرجاؤں میں وقتاً فوقتاً ایسے مرد عورت بھی ملیں گے جو نہایت خاموشی کے ساتھ کسی ایک گوشہ میں مراقبہ (meditation) کر رہے ہیں، آئے دن مذہبی تقریریں ہوتی رہتی ہیں جن کو بڑی دلچسپی اور شوق و توجہ سے سُنا جاتا ہے۔ مونٹریل کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور ضخیم اخبار "مونٹریل اسٹار" ہے۔ اس اخبار کے سنڈے اڈیشن کے چار صفحے بلاناغہ بڑی پابندی کے ساتھ خالص مذہبی مضامین و مواعظ کے لیے وقف رہتے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی مذہبی مقالات و مضامین برابر شائع ہوتے ہیں۔ یہاں پروٹسٹنٹ کے مقابلہ میں کیتھولک عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ لوگ مذہب کے معاملہ میں بڑے کٹر اور سخت ہوتے ہیں، پورے ملک میں جگہ جگہ ان کے اپنے سکول ہیں جہاں بچوں اور بچیوں کو مذہبی تعلیم لازمی طور پر دی جاتی ہے، اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں بھی فیکلٹی آف تھیالوجی کے ماتحت مذہب کی اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کا بندوبست ہے۔ مذہب یہاں کی زندگی میں کتنا دخیل ہے! اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مونٹریل میں بازاروں، سڑکوں اور گلی کوچوں کے نام اکثر و بیشتر کسی بزرگ مذہبی شخصیت اور مقدس پیشوا کے نام پر ہیں۔ مونٹریل میں عیسائیوں کے ساتھ یہودی بھی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں، اور اپنی قومی روایات کے مطابق یہاں کی تجارتی اور صنعتی و حرفتی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان کی مذہبی تنظیم بھی بڑی مضبوط اور وسیع ہے جس کے ماتحت یہ لوگ مذہبی تعلیم و تربیت اور مذہبی عبادات و فرائض کی بجا آوری کا اہتمام و انتظام کرتے ہیں۔ یہ لوگ مذہبی معاملات و مسائل میں عموماً اس قدر سخت ہیں کہ یہودی ذبیحہ (کوشر) کے علاوہ اور کوئی ذبیحہ نہیں کھاتے۔ ایک مرتبہ ریل کے ذریعے مونٹریل سے نیویارک جاتے ہوئے میرا اور ایک یہودی فیملی کا ساتھ ہو گیا، یہ فیملی ایک مرد، ایک عورت اور دو بچوں پر مشتمل تھی، مرد کی عمر تیس بتیس برس سے زیادہ نہیں ہو گی، لیکن ڈاڑھی بڑی گنجان و دراز تھی، باتوں میں انھوں نے بتایا کہ اگر کسی شہر میں کوشر دستیاب نہ ہو تو وہ ترکِ لحم کر دیں گے اور دوسری چیزوں پر قناعت کریں گے۔

یورپ اور امریکہ میں جو یونیورسٹیاں ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کسی نہ کسی مذہبی سوسائٹی یا مذہبی ادارہ کے ماتحت یا کم از کم اُس کے زیر اثر ہیں۔ اسی وجہ سے ان یونیورسٹیوں کے سب سے بڑے دروازہ کی محراب پر حضرتِ عیسیٰ کا قول یا انجیل کی کوئی عبارت کندہ ہے اور عام طور پر ہر یونیورسٹی کے ساتھ ایک گرجا بھی ہوتا ہے، ان یونیورسٹیوں میں جو تقریبات ہوتی ہیں، اُن کا آغاز اور انجام دونوں عام طور پر دعا سے ہوتے ہیں، اور یونیورسٹیوں کا کیا ذکر! شاید آپ کو معلوم ہو، چار سو برس کی مدت ہو گئی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انگلینڈ کے دارالعوام (House of Commons) کے کسی ایک دن کی کارروائی بھی دعا کے بغیر شروع ہو گئی ہو۔

کناڈا چونکہ اپنی مذہبیت کے لیے سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے، اس لیے راہب (monks) اور راہبات (nuns) بھی یہاں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ ان مردوں اور عورتوں کا تو خیر کام ہے ہی دُنیا سے الگ تھلگ رہ کر شب و روز عبادت میں مصروف رہنا۔ ان کے علاوہ عام مرد اور عورتیں بھی مجموعی طور پر مذہبی احساسات و جذبات سے عاری نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی عام گفتگوؤں، مذہبی اجتماعات، مذہبی سرگرمیوں اور مذہبی تیر تہوار کے موقع پر ان کے اہتمام و انتظام اور مذہبی لٹریچر کی بکثرت اشاعت اور ان لوگوں کی مشنری سرگرمیوں سے ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے اور ان چیزوں نے انسان کو مذہب سے بیگانہ بنا دیا ہے، لیکن امریکہ اور یورپ میں جو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اگر ایک طرف ہکسلے کی کتاب "انسان اکیلا کھڑا ہے" (Man stands alone) مذہب کی مخالفت اور اس کے معتقدات کے رد میں شائع ہوتی ہے تو فوراً اس کے جواب میں ایک نہایت معقول اور مدلل کتاب خدا کے وجود کے اثبات میں "انسان اکیلا نہیں کھڑا ہے۔" (Man does not stand alone) شائع ہو جاتی ہے، اور حق یہ ہے کہ مادی زندگی کے بحران و تلاطم، دولت کی افراط، لذائذِ حیات کی بہتات، سائنس کی ہلاکت انگیز

ایجادات واختراعات، گزشتہ دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریاں، بین الاقوامی تنازعات وکش مکش، سنٹرل ایشیااور یورپ کے ایک حصے میں کمیونزم کی فتوحات اور چیرہ دستیاں ان سب نے مل جل کر امریکہ اور یورپ کے انسان میں روحانی طمانیت و سکون کی تلاش کا جذبہ اور مذہبی شعور جوہر انسان کے نہاں خانہ قلب میں فطرتاً مستور ہوتا ہے، اسے بیدار کر دیا ہے۔ مغربی تہذیب کے جو عناصر اپنے اندر ایک قسم کا آتش گیر مادہ رکھتے ہیں اور جو یورپ میں صنعتی انقلاب کا فوری نتیجہ ہیں، ان پر جس طرح ایک مشرقی ذہن تنقید اور نکتہ چینی کرتا ہے، آج یورپ اور امریکہ میں مصنفین و مصلحین کا اچھا خاصا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو برملا اپنی تحریروں اور تقریروں میں اپنی تہذیب اور سماج کے تخریبی اور خدا فراموش عناصر کی دل کھول کر مذمت کر رہا ہے۔ میں متعدد مذہبی اجتماعات میں ایک عام سامع کی حیثیت سے شریک ہوا تو میں نے دیکھا کہ اکثر وبیشتر تقریروں میں مادہ پرستی اور لذائذ جسمانی میں انہماک کی برائی کی جاتی اور خدا کی طرف واپس لوٹنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ امریکہ کا ایک مشہور مبلغ جس کا تذکرہ کئی بار "ریڈرس ڈائجسٹ" میں بھی آچکا ہے، اس کی تقریر اور وعظ کا ٹیپ کا بند سوائے BACK TO GOD کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں اور تقریر کی اثر انگیزی کا یہ عالم ہے کہ جہاں کہیں وہ جاتا ہے، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے مرد اور عورت ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے اور چیخ مار مار کر روتے ہیں۔ بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے یہ جس کسی ملک میں اپنے اسٹاف کے ساتھ پہنچتا ہے، وہاں کی حکومت کو اس کے قیام وغیرہ کے لیے خاص انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔ سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹریوں کا ایک لشکر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے، اس کے نام روزانہ جو خطوط آتے ہیں ان کا روزانہ اوسط کم وبیش پانچ سو ہے۔ اس مشنری کا نام بلی گراہام (BILLY GRAHAM) ہے، اس کے مواعظ کی شعلہ افشانی کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ موفق اطلاعات کے مطابق اس شخص نے ۱۹۵۵ء میں برطانیہ عظمیٰ کا دورہ کیا تو بیس لاکھ مرد اور عورت، بوڑھے اور جوان اس کی تقریروں میں شریک ہوئے، لندن میں اس کا قیام صرف ایک ہفتہ رہا۔ اس ایک ہفتہ میں اس نے چار لاکھ سے زیادہ انسانوں کو خطاب کیا، ان میں سے تیس ہزار مردوں اور عورتوں نے اس کے سامنے عہد کیا کہ آئندہ وہ مذہبی زندگی بسر کریں گے۔ ڈاکٹر ٹاؤنلے لارڈ (Dr Townlay lard) اور سر فرینک مڈلیکوٹ ممبر پارلیمنٹ (Sir Frank Medlicot M.P.) دونوں کا بیان ہے کہ انگلستان میں جہاں کہیں ہم گئے ہیں، ہم نے دیکھا ہے کہ بلی گراہام کے دورہ کے بعد وہاں کی فضا بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے لوگ مذہب بیزار تھے، اب ان میں مذہبی جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے اور جو مذہب پر گفتگو پسند نہیں کرتے تھے، اب انہیں اُٹھتے بیٹھتے مذہب کا ہی ذکر ہے (ریڈرس ڈائجسٹ، اکتوبر ۱۹۵۵ء، صفحات ۲۷-۲۸)۔

عام مسلمانوں کی طرح پہلے میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ اسلام پر مختلف زبانوں میں لٹریچر کا جو عظیم ذخیرہ ہے، وہ کسی اور مذہب کو نصیب نہیں، لیکن ایک مرتبہ میک گل یونیورسٹی لائبریری میں مذہب کے سیکشن اور پھر اس یونیورسٹی کے ماتحت فیکلٹی آف تھیالوجی کے اپنے کتب خانہ کا جائزہ لیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، دونوں جگہ بلا مبالغہ پچاس ہزار سے کم کتابیں نہیں ہوں گی جو صرف عیسائیت سے متعلق تھیں۔

ایک زمانہ تھا جب اقبال نے مشرق اور مغرب کے درمیان محاکمہ کرتے ہوئے کہا تھا:

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اقبال کا یہ قول اس عہد کے لیے تو درست تھا کہ جب مشرق شہنشاہیت اور استعماریت کی زنجیروں میں جکڑبند ہونے کے باعث اپنے خصائص، علم و عمل اور محاسنِ اخلاق سے محروم ہو گیا تھا اور دوسری جانب یورپ صنعتی تہذیب و تمدن کے دور اوج و شباب سے گزر رہا تھا۔ یہ دور اب گزر چکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف مشرق بیدار ہو رہا ہے اور دوسری جانب چونکہ یورپ کا زعم لمن الملک الیوم ٹوٹ چکا اور اس کا پندار ختم ہو گیا ہے، اس لیے مادہ پرستی نے اس کی سادہ فطرت پر جو پردے ڈال دیے تھے، اب آہستہ آہستہ وہ اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اس بناء پر آج کلی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ "افرنگ میں عشق" بالکل مردہ ہے، اور "مشرق کی عقل" پہلے کی طرح اب بھی غلام ہے۔ ایک مرتبہ انسٹی ٹیوٹ میں مذہب اور ریاست پر گفتگو ہو رہی تھی، میں نے اس سلسلہ میں بطور اظہارِ تعجب کہا کہ اگر مسلمان حکومتیں جنگ کی تیاری کر رہی ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ دُشمنوں کے ڈر سے جنگ کی تیاری کرنا خود اسلام کی تعلیم ہے۔ البتہ تعجب اور حیرت اس پر ہے کہ شریعتِ عیسوی کی پیرو اقوام کس طرح جنگ کا اہتمام اور بندوبست جائز سمجھتی ہیں، اس پر پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ نے کہا کہ "مسٹر کنیڈی صدر امریکہ چونکہ کیتھولک ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ کی تیاریاں جو کچھ کر رہے ہیں وہ جنگ روکنے کے لیے کر رہے ہیں، لیکن اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ جنگ کرنی ہی پڑی تو — مسٹر کنیڈی نے اعلان کیا — میں خود صدارت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔" فرمایئے کہ کیا اس ذہن کو بھی آپ یہ کہیں گے کہ اس کے افکار اقبال کے اصطلاحی "عشق" کی آمیزش سے معرّا ہیں، جنوبی امریکہ میں رنگ و نسل اور کالے گورے کا سوال کس قدر پیچیدہ اور سخت ہے؟ ہر باخبر شخص اس سے واقف ہے کہ آخر خود مسٹر کنیڈی ہی اس شورش و جنوں کی بھینٹ چڑھ گئے! ۱۹۶۲ء کے آخر مہینوں کا ذکر ہے، امریکہ کے ایک شہر برمنگھم (اس نام کا ایک شہر انگلینڈ میں بھی ہے۔) کے ایک سکول میں دو نیگرو لڑکے داخل ہوئے، سفید فام لوگوں نے

اس پر سخت احتجاج کیا اور حسب عادت و معمول قسم قسم کی شرارتیں کیں، آخر اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ اس پر غور کرنے کے لیے بلایا گیا۔ شام کے چار پانچ بجے کے درمیان کا وقت ہوگا کہ اسکول کی عمارت میں انتظامیہ کمیٹی کے ممبر اس پر غور کر رہے تھے کہ موجودہ فساد و بدامنی کی موجودگی میں ان افریقی بچوں کو اسکول میں رہنے دیا جائے یا ان کو خارج کر دیا جائے اور ادھر سفید فام فسادیوں نے سکول کی پوری عمارت کو منتظمہ کمیٹی پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے گھیر رکھا تھا، ٹھیک اس وقت صدر کنیڈی نے اپنے دفتر سے برمنگھم کے ان فساد پروروں کے نام ایک تقریر نشر کی جسے ٹیلی وژن پر میں نے بھی سُنا تھا، یہ عجیب و غریب اور نہایت پرجوش وولولہ انگیز تقریر تھی، اس میں صدر کنیڈی نے انسانیت، شرافت اور جمہوریت کا واسطہ دے کر بڑے دردانگیز لب ولہجہ میں ان لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اسکول میں نیگرو بچوں کے داخلہ پر احتجاج نہ کریں۔ اس تقریر میں جو خلوص، جوش اور جذبہ تھا وہ اس بات کی روشن دلیل تھا کہ مقرر کا دل روحانی اقدار، انسانیت کی عظمت سے پُر ہے۔ اس کے علاوہ اور لوگوں سے بھی سنا کہ مسٹر کنیڈی کٹر مذہبی انسان تھے، ہر اتوار کو گرجا پابندی سے جاتے تھے۔ اسی طرح میرے ابتدائی زمانہ قیام میں کنیڈا کے وزیر اعظم مسٹر ڈفرن بیکر تھے، ان کی نسبت بھی لوگ کہتے تھے کہ اس درجہ مذہبی انسان ہیں کہ شراب تک نہیں پیتے۔

میں نے وہاں کے مذہبی لوگوں میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کیں جنہوں نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے ایک یہ کہ چونکہ یہاں دکھاوا، ریاکاری اور تصنع و بناوٹ ہے ہی نہیں، جو بات ہے صاف اور بلا غل و غش ہے، اس لیے یہاں جو رند ہے (اور تعداد انہیں کی زیادہ ہے) وہ کھلا ہوا رند ہے، اسی طرح جو پارسا ہے وہ ظاہر اور باطن دونوں کے اعتبار سے یکساں ہے۔ اندر کا اصل حال تو خدا ہی جانتا ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، جو لوگ مرد ہوں یا عورت شروع سے ہی مذہب کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی قرار دے لیتے ہیں، وہ بڑی سادگی سے رہتے ہیں، خلوص اور تندہی سے کام کرتے ہیں۔ جفاکشی سے گھبراتے نہیں اور دنیاوی عیش و آرام سے بے نیاز ہو کر رہتے ہیں۔ یہ مذہب کو حصول جاہ و منصب کا آلہ و وسیلہ نہیں بناتے، نذرانے نہیں لیتے، چہار گونہ یا پانچ گونہ سفر خرچ وصول نہیں کرتے، انہیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے، وہ رقص و سرود کی مجالس شبانہ یا حسن عریاں و بے حجاب کی جلوہ گاہوں میں نظر نہیں آئیں گے، یہ عبادت کریں گے تو خالص عبادت کی غرض سے۔ حج اور اسمگلنگ کی نیت سے! شاید وہاں اس کا تصور بھی نہیں ملے گا۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی خدمت اور تبلیغ کرتے ہیں تو صرف زبان سے نہیں، بلکہ علم، عمل اور خدمت ان تینوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ خدمت کے لیے فروتنی، بے نفسی اور اخلاص ضروری ہے، یہ تینوں صفات ان کے اندر ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں کا "مولوی" نرا مولوی نہیں ہوتا، وہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی تقابلی مطالعہ کرتا ہے۔ مذہبی علوم و فنون کے ساتھ علوم جدیدہ بھی حاصل کرتا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ان علوم میں درک اور کمال پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ مشنریز میں کام کرنے والوں میں آپ کو انجینئر بھی ملیں گے، اور ڈاکٹر بھی، پروفیسر بھی نظر آئیں گے، اور بیرسٹر بھی۔ جو علوم و فنون کا حال ہے وہی زبانوں کا ہے، یہ لوگ کئی کئی زبانیں جانتے ہیں اور صرف شُدبُد کی حد تک نہیں، بلکہ ان میں بولتے ہیں، تقریر کرتے اور لکھتے ہیں۔

مغرب میں مذہب کی نسبت ہم میں سے بعض لوگوں کا جو خیال ہے وہی اخلاقی ڈسپلن اور ضابطہ خیر و شر کے متعلق بھی ہے۔ یعنی یہاں ایپقوریت کا دور دورہ ہے، ہر شخص کو عیش طلبی اور حظ جوئی کی فکر ہے، لیکن جیسے وہ پہلی بات غلط تھی یہ بھی غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کا بے باکانہ اور آزادانہ اختلاط و ارتباط، جنسی معاملات و مسائل میں ان کا لبرلزم، شراب کی افراط و بہتات، دولت اور سامانِ عشرت و نشاط کی فراوانی ان سب چیزوں نے مل ملا کر مغربی سوسائٹی کے اعصاب میں شدید قسم کا ہیجان و تشنج پیدا کر دیا ہے، لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ وہاں سرے سے کوئی ضابطہ اخلاق یا نیکی اور بدی کا کوئی معیار ہی نہیں ہے، ملک کا جو قانون ہے، وہ خود اس ضابطہ اور معیار کا احترام کرتا ہے اور غالباً اس حد تک کہ ہم لوگوں کو اس پر تعجب ہونا چاہیے۔ ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور پر عدالت کی طرف سے محض اتنی سی بات پر جرمانہ کر دیا گیا کہ ایک شخص نے اس کو کرایہ پر لینا چاہا، مگر یہ صاف انکار کر کے آگے بڑھ گیا۔ ڈرائیور نے اپنی صفائی میں کہا کہ میری بیوی بیمار تھی، مجھے اس کو گھر سے لے کر شفا خانے پہنچانا تھا، اس لیے میں نے سواری بٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر عدالت نے کہا تمہارا عذر واقعی معقول ہے، لیکن جس انداز سے تم نے اس شخص کو ٹیکسی میں بٹھانے سے انکار کیا ہے، اس سے اس کو صدمہ پہنچا ہے، اس لیے تم پر جرمانہ کرنا ضروری ہے تاکہ آئندہ تم کسی سے دل شکن انداز میں گفتگو نہ کرو۔

امریکہ اور کناڈا میں ایک خاص قسم کا طبقہ ہے جو بیٹنک (BEATNICK) کہلاتا ہے۔ ان کو سوسائٹی کے عوائدِ رسمیہ اور معاشرتی قوانین و ضوابط سے بغاوت ہوتی ہے۔ انھیں ہر ایسی چیز کے کرنے میں لطف آتا ہے جو سوسائٹی میں معیوب و مذموم سمجھی جاتی ہے، یہ نہایت میلے کچیلے کپڑے پہنیں گے، برسوں غسل نہیں کریں گے، ہفتوں منہ ہاتھ نہیں دھوئیں گے، بالوں میں نہ تیل ہوگا اور نہ کنگھی۔ عورتوں اور مردوں کے اختلاط میں کسی قسم کی پردہ داری اور لحاظ و شرم سے کام نہیں لیں گے۔ مونٹریل اور نیویارک میں ان لوگوں کے چند خاص خاص محلوں اور علاقوں میں

مکانات ہیں جہاں یہ رہتے ہیں۔ اپنے گھروں میں یہ جو چاہیں کریں، حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی، لیکن جب یہ لوگ کسی رسٹوران، کسی پبلک جگہ پر بیٹھ کر یہ حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو پولس چھاپہ مار کر ان کو گرفتار کر لیتی ہے۔ ایک مرتبہ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ مغرب کے بعد ایک رسٹوران میں کافی پینے پہنچا اور ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ دائیں جانب نظر ڈالی تو صورت و شکل سے پانچ چھ مرد اور عورت ہیپنک دکھائی دیے، یہ لوگ کافی اور سگریٹ پی رہے تھے۔ وحشت بھی ہوئی اور گھبراہٹ بھی۔ کافی میز پر آ ہی گئی تھی، اس لیے جلدی جلدی زہر مار کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ دیکھا کہ پولس اندر جا رہی ہے۔